شہر یار کی علامتی شاعری میں واقعۂ کربلا

ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق

نئی غزل کو جن شاعروں نے علامتی شاعری کے ذریعہ متعارف کرایا ان میں شہر یار کا نام بہت نمایاں ہے شہر یار نے معاصر عہد کی صورت حال کو علامتوں کے پردے میں منعکس کیا ہے وہ تہذیبی واخلاقی انحطاط اور انسانی اقدار کے زوال سے خوف زدہ اور افسردہ ہیں ان کا یہی خوف اور افسردگی ان کی شاعری پر محیط ہے انہوں نے اس کا اظہار سمندر، دریا، پیاس، شہر، گھر، دشت، صحرا،

ہوا، دن، رات ،سورج ، دھوپ اور سراب وغیرہ علامتوں کے پیرائے میں کیا ہے۔لیکن نیند، خواب، دھند،غبار، ریت،سایہ، پرچھائیں وغیرہ ان کی مخصوص علامتیں ہیں در اصل ان کی شاعری خواب اور حقیقت کا تصادم،قنوطیت، بے یقینی، لاحاصلی، ناامیدی اور فریب ذات وکائنات سے عبارت ہے۔

شہریارجس زمانے (۶۰ئ) میں شعری منظرنامے پر طلوع ہوئے اس وقت ہمارے جدید شاعر قدیم علامتوں میں نئے معنی ومفاہیم کی جستجو کے ساتھ نئی علامتوں کی تشکیل وتفحص میں مصروف تھے یہی وہ عہد ہے جس میں'واقعہ کربلا' اردو شاعری میں ایک تخلیقی رجحان کی حیثیت اختیار کررہا تھا اس کی سب سے بری وجہہ یہ تھی کہ اس دور میں ہم جن مسائل ومشکلات کا سامنا کررہے تھے اس صورت حال اور کیفیت کی ترجمانی کیلئے واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات مناسب ترین ذریعۂ اظہار محسوس ہورہے تھے نیز علامات کربلا کو نئی شاعری میں اس لئے بھی زیادہ استعمال کیا گیا کہ اس کے اطلاقات کا دائرہ وسیع اور کثیر المعنی ہے۔

واقعہ کربلا اور اس سے وابستہ عناوین وموضوعات ابتداہی سے ہماری شعری روایت کا حصہ رہے ہیں اور ان کے مفاہیم بھی تسلیم شدہ ہیں چنانچہ جدید شاعروں نے اپنی شاعری میں واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات کاشعوری استعمال کیا انہی جدید شاعروں میں شہریار بھی شامل ہیں جنہوں نے واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات میں نئے معنی ومفاہیم کو دریافت کیا، ہم اپنے اس مقالے میں شہریار کی شاعری میں واقعہ کربلا اور اس سے مخصوص علامتوں کا تفصیل سے جائزہ لیں گے لیکن یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی کردیا جائے کہ واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات شہریار کی شاعری کا کلیدی موضوع نہیں بلکہ جزوی موضوع ہیں۔

شہریار کی شاعری میں واقعہ کربلا کے علامتی اظہار کا آغاز ستر کی دہائی سے ہوا، ان کا پہلا مجموعہ ''اسم اعظم''۱۹۶۵ء میں منصۂ شہود پر آیا اس کی نظموں اور غزلوں میں کہیں علامات کربلا کا استعمال نہیں ہوا، شہریار کے یہاں علامات کربلا کا استعمال ''ساتواں در''۱۹۶۹ء سے شروع ہوا۔ اس کے بعد ''ہجر کے موسم''۱۹۷۹ئ'' خواب کا در بند ہے''۱۹۸۵ء''نیند کی کرچیں''۱۹۹۵ء میں بتدریج اپنے معنوی امکانات کو روشن کرتا ہوا نظر آتا ہے۔شہریار کی نظموں اور غزلوں دونوں میں ان علامتوں کا استعمال ہوا ہے۔عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ شہریار کی شاعری کا مرکزی موضوع نہیں ہے لہٰذا اس کا استعمال ان کی شاعری میں بہت زیادہ تو نہیں ہوا ہے مگر جہاں بھی ہوا ہے وہاں یہ علامتیں اپنی معنویتوں کو پوری طرح

منور کررہی ہیں شہریار نے ان کے وسیع تر امکانات کی جستجو کے بعد انہیں اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے آیئے! دیکھتے ہیں کہ شہریار کی نظموں میں یہ علامتیں کن معنی ومفاہیم کی ترجمانی کررہی ہیں اس سلسلے میں ''ساتواں در'' سے ان کی ایک نظم ''خواب حسینؑ کے وارثوں سے'' ملاحظہ فرمائیں:

میں مانتا ہوں
تم خواب حسینؑ کے وارث ہو
میں جانتا ہوں
تم پیاس کی شدت میں بھی سراب کو دریا نہیں کہنے والے
تسلیم مجھے
جس راہ میں نشیب وفراز نہیں
وہ راہ جنوں کی راہ نہیں
یہ راز مگر بتلاؤ مجھے
تلوار کا سایہ سر کی بلندی کے درپے ہے
کوفۂ زیست میں قطرۂ آب امید نہیں ہے
پھر بھی شہادت کے اعزاز کے لائق تم میں کوئی نہیں ہے

مجھے اس نظم کی قرأت کرتے وقت خلیل الرحمن اعظمی یاد آرہے ہیں انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''ساتواں در کی بعض نظمیں دیکھنے میں ایسی سیدھی سادھی لگتی ہیں کہ پہلی نظر میں گمان بھی نہیں ہوتا کہ ان کے پیچھے گہری فکر ہے۔'' شہریار کی یہ نظم اسی طرح کی ایک نظم ہے کہ جو بظاہر دیکھنے میں سیدھی سادی ہے مگر اس کے متن میں گہری معنویت پوشیدہ ہے۔

یہ نظم گیارہ مصرعوں پر مشتمل ہے اس میں شہریار کی وہ بیشتر علامتیں موجود ہیں جو ان کی شاعری کا اختصاص ہیں مثلاً خواب، پیاس، سراب، دریا، جنوں وغیرہ۔ نظم کا آغاز ایجابی لہجہ میں واحد متکلم کے صیغہ میں ہوتا ہے شاعر کہتا ہے کہ میں قبول کرتا ہوں کہ تم خواب حسینؑ کے وارث ہو۔ آغاز ہی میں شاعر کا مخاطب کو حسینؑ کا وارث نہ کہہ کر خواب حسینؑ کا وارث قرار دینا بھی معنی خیز ہے کیونکہ حسینؑ کا وارث ہر وہ شخص ہوسکتا ہے جو نسل حسینؑ سے ہے مگر خواب حسینؑ کے وارث وہی اشخاص ہوسکتے ہیں جو حسینؑ کے ارفع واعلیٰ مقاصد کی اہمیت ومعنویت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نیز ان

کے تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔

عرض کیا جاچکا ہے ''خواب'' شہریار کی مخصوص علامت ہے یہ کہیں شہریار کے یہاں انسانی خواہشوں اور آرزوؤں کی پناہ گاہ ہے تو کہیں ناکام ارادوں کی فرودگاہ ہے کہیں حقائق کی باز آفرینی کا ذریعہ ہے مگر یہاں 'خواب' مقصد کی ترجمانی کررہا ہے اور یہ مقصد بھی معمولی مقصد نہیں، کوئی عظیم مقصد ہے ۔شاعر ہمیں ابتدا ہی میں اس مقصد کی اہمیت ومعنویت کا احساس کرانا چاہتا ہے کہ تم ''خواب حسینؑ'' کے وارث ہو اور خود حسینؑ ''خواب ابراہیمؑ'' کی تعبیر ہیں۔شہریار نے ایک مصرعہ میں پورے تاریخی منظر نامہ کو ہمارے قرطاسِ ذہن پر منور کردیا ہے اس کے بعد انتہائی منفعل لہجہ میں کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہے تم پیاس کی کیفیت میں بھی سراب کو دریا نہیں کہہ سکتے ہو، یہاں 'پیاس' انسانی احتیاج کی علامت ہے اور 'سراب' فریب نظر(باطل) ہے 'دریا' زرخیزی (حق) کی علامت ہے مطلب یہ ہے کہ تم سخت ترین حالات میں بھی تلبیس حق نہیں کرسکتے اور نہ باطل کے فریب میں مبتلا ہوسکتے ہو، کیونکہ تمہیں حق کا عرفان حاصل ہے۔ شاعر اپنے تیقن کا اظہار کرکے اچانک لہجہ بدل دیتا ہے اور آگہی کے لہجے میں کہتا ہے کہ مجھے یہ سب تسلیم ہے مگر یاد رہے جس راہ میں مشکلیں اور دشواریاں نہ ہوں وہ راہ جنوں کی راہ نہیں ہوسکتی، جنوں شہریار کے یہاں جہد مسلسل کی علامت ہے یعنی جب تک انسان میں اپنی منزل مقصود کو پانے کا جنون نہیں ہوگا اس وقت تک اسے کامیابی نہیں مل سکتی۔ یہاں منزل مقصود ''جنوں کی راہ'' شہادت کی راہ ہے۔آخر کے چار مصرعوں میں شہریار خواب حسینؑ کے وارثوں سے استفہامیہ لہجے میں خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم مجھے ذرا یہ تو بتلاؤ کہ آخر کب تک خوابِ غفلت میں رہوگے دشمن کی تلواروں کے سائے تمہارے سروں کی بلندی تک آپہونچے ہیں (یہاں تلوار کے بجائے تلوار کے سائے کا سروں تک پہنچنا بھی قابل التفات ہے یعنی ابھی تحفظ کے امکانات باقی ہیں) اور تم ابھی بھی کوفۂ زیست میں قطرۂ آب امید سے محروم ہو۔یعنی دشمن کی تلواروں کا سایہ بھی تمہارے جذبۂ شجاعت کو مہمیز کرنے میں ناکام ہے کیونکہ نفاق تمہاری حیات کا ناگزیر حصہ بن چکا ہے لہٰذا اب امید کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔ پھر بھی شہادت کے اعزاز کے لائق تم میں کوئی نہیں ہے۔'' پھر بھی'' کا ٹکرا اس بات کی غمازی کررہا ہے کہ خواب حسینؑ کے وارث شہادت جیسے عظیم اعزاز کے لائق نہیں ہیں مگر اس کے باوجود ان میں اس اعزاز سے سرفراز ہونے کی خواہش موجود ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میدان عمل میں شہادت حاصل کرنے کا حوصلہ

ان میں نہیں ہے۔ نظم کے آخری مصروعوں میں کوفۂ زیست اور ''قطرۂ آب امید'' کی تراکیب نے نظم کے سیاق وسباق کو روشن کر دیا ہے۔

''ساتواں در'' سے اس سلسلے کی ایک اور نظم دیکھئے، یہ نظم مندرجہ بالا نظم کی توسیع معلوم ہورہی ہے:

ہوا کی زد میں چراغ امید کب نہیں تھا
مگر ہاتھوں کی کپکپاہٹ
لبوں پر ریگ سکوت
آنکھوں میں آنسوؤں کے امنڈتے دریا
تم اپنے آباء کے کارناموں سے بے خبر ہو
حسین ابن علی کے وارث
شہید ہوتے ہیں کربلا میں

اس نظم میں بھی شہریار کی بعض مخصوص علامتیں ہوا، ریگ، آنسو، دریا وغیرہ موجود ہیں لیکن یہاں یہ علامتیں نئے معنی ومفاہیم کی ترجمانی کررہی ہیں۔ اس نظم میں شہریار نے حسین ابن علیؑ کے وارثوں کو اُن کی حقیقی وراثت ''شہادت'' کی یاد دلائی ہے اور راہِ شہادت سے فرار اختیار کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے کہتے ہیں کہ ہمیشہ سے اہل وفا (حق پرستوں) کی امیدوں کا چراغ ہوا کی زد میں رہا ہے ''ہوا'' یہاں تخریبی طاقتوں کی علامت ہے اب مطلب یہ ہوا کہ تخریب کار ہمیشہ سے چراغ حق کو بجھانے کے درپے رہے ہیں لیکن اہل حق نے اپنی ذہانت وذکاوت اور وقت پڑنے پر اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرکے اہل باطل کی سازشوں کو ناکام بنایا ہے شاعر کہتا ہے مگر میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ہاتھ دشمن کے خوف سے مرتعش ہیں لبوں پر خاموشی کا صحرائے بے کنار اور آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا امنڈ رہا ہے جو تمہاری بے بسی اور لاچارگی کا مظہر ہے۔ شاید تم اپنے اجداد کے کارناموں سے بے خبر ہو، اگر تم حسینؑ کے سچے وارث ہو تو شہادت کو گلے لگانے سے دریغ نہ کرو۔ کیونکہ حسینؑ کے وارثوں نے ہمیشہ شہادت کو سعادت سمجھا ہے اور مصاف نینوا میں شہادت کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا جس کی روشن ترین مثال ارض کربلا ہے جہاں حسینؑ اور ان کے وارثوں نے موت کو قبول کیا مگر باطل قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ لہٰذا اگر تم بھی حسینؑ کے سچے وارث

ہوتو باطل قوتوں کے مقابل سینہ سپر ہوجاؤ، اس نظم کے آخری دومصروعوں میں شہریار نے ہلکا سا طنز بھی کیاہے۔طنز کی آمیزش نے نظم کو ایک نیا رخ دے دیاہے:

حسینؑ ابن علی کے وارث
شہید ہوتے ہیں کربلا میں

یعنی جوحسینؑ کے واقعی وارث تھے وہ تو معرکہ کربلا میں شہید ہوگئے اب فقط وراثت کے دعویدار باقی ہیں اور اگر یہ مدعیان وراثت حسینؑ کے سچے وارث ہوتے تو کربلائے عصر میں باطل قوتوں سے معرکہ آرا ہوتے مگر سچ تو یہ ہے کہ ان کی قوت مدافعت ومزاحمت ختم ہوچکی ہے اور وہ بھی ایسے دور میں جب باطل سے برسرپیکار رہنے کی زیادہ ضرورت ہے اگر یہ حسین ابن علیؑ کی عظیم قربانیوں سے واقف ہوتے تو کبھی عصر حاضر کے یزیدوں سے خوف زدہ ہوکر ان کے آستانوں پر سربہ سجود نہ ہوتے بلکہ انکار بیعت کے بعد پرچم حق کی سربلندی کے خواہاں ہوتے اور نشان باطل کو محو کرنے کی کوشش کرتے بالفرض کسی وجہہ سے ایسا کرنے میں ناکام بھی ہوتے توحسین ابن علیؑ کے وارثوں کی طرح بخوشی شہادت کو اختیار کرلیتے۔اس نظم میں یہ مفہوم بھی پنہاں ہے کہ روشن ضمیری اور بلندیٔ کردار ہی انسان کا اصل جوہر ہے۔

کربلا اور اس کے تعلیقات کا استعمال جس طرح شہریار کی نظموں میں ہواہے اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی یہ تعلیقات موجود ہیں بلکہ میرا خیال ہےنظموں سے زیادہ ان کی غزلوں میں واقعۂ کربلا کے معنوی امکانات روشن ہوئے ہیں۔آیئے، دیکھیں کہ شہریار کی غزلوں میں یہ علامتیں کن معنی ومفاہیم کی ترجمانی کررہی ہیں ضرورت پڑنے پر ہم بعض اشعار کا تجزیہ کرکے اُن کے مفاہیم کو دریافت کریں گے یہاں اِس قبیل کےصرف چند اشعار پیش کئے جارہے ہیں:

حسین ابن علیؑ کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

***

گذرے تھے حسین ابن علیؑ رات اِدھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

***

آتی کسی کو راس شہادت حسینؑ کی
دنیا میں ہم کسی کو تو سیراب دیکھتے

***

ہر سمت خموشی ہے رات کالی ہے
نہ جانے کون سے افتاد پڑنے والی ہے

***

شاخِ شجر سے پتے گرے جب بھی ٹوٹ کے
روئی تمام خلقِ خدا پھوٹ پھوٹ کے

***

قطرۂ اشک سے آنکھوں کا بھرم باقی ہے
چھین لے جائے نہ اس کو بھی ہوا دنیا کی

***

اہل وفا کو شوقِ شہادت ہے آج بھی
لیکن کسی کے ہاتھ میں خنجر نظر تو آئے

***

دریا کے پاس دیکھو کب سے کھڑا ہواہے
یہ کون تشنہ لب ہے پانی سے ڈر رہاہے

***

شدید پیاس تھی پھر بھی چھوا نہ پانی کو
میں دیکھتا رہا دریا تیری روانی کو

غزل کے ان شعروں میں بھی شہریار کی بعض مخصوص علامتیں گھر، رات، اشک، ہوا، دریا، پانی، پیاس وغیرہ موجودہیں لیکن یہاں یہ علامتیں مختلف النوع تہہ دار اور کثیرالجہات معنی ومفاہیم کی ترجمانی کررہی ہیں۔ شہریار نے معاصر عہد کی صورت حال کو ان علامتوں کے توسط سے بڑی خوش اسلوبی سے نمایاں کیاہے آیئے! ان علامتوں کی تفہیم کیلئے کچھ شعروں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں:

حسین ابن علیؑ کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

یہ شعر بظاہر بہت سادہ سا شعر ہے اور مفہوم بھی بالکل واضح ہے مگر اس میں گہری معنویت موجود ہے اس شعر میں حسین ابن علیؑ 'حق' کا استعارہ ہیں اور کربلا 'صراط حق' کی علامت ہے اب مطلب یہ ہوا کہ موجودہ عہد میں اہل حق صراط حق پر گامزن ہیں مگر باطل پرست قوتیں ان کی راہ میں مزاحم ہورہی ہیں اور اہل ایمان حق وباطل کی اس مزاحمت میں کوئی کردار ادا کرنے کے بجائے اپنے گھروں کے اندر بیٹھ کر اہل حق کی شکست کے منتظر ہیں اسی مفہوم کو شہریار نے دوسرے شعر میں اور بہتر انداز میں اس طرح ادا کیا ہے:

گذرے تھے حسین ابن علی رات اِدھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

آپ نے دیکھا محولہ دونوں شعروں میں قریب قریب ایک ہی مفہوم ہے لیکن دونوں شعروں کے لہجے مختلف ہیں۔ پہلے شعر کا لہجہ بیانیہ ہے اور دوسرے کا استعجابیہ، اس شعر میں شاعر تحیر کے عالم میں مبتلا ہے کہ ہم پر صہیونی طاقتوں کا خوف اس قدر غالب آچکا ہے کہ اب ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اہل حق کی معیت ومعاونت ہمارا اسلامی اور انسانی فریضہ ہے ہم حق پرستوں کو دیکھ کر ان کی صفوں میں شامل ہونے کے بجائے ان سے نگاہیں چرارہے ہیں۔ اس شعر میں 'کوئی بھی نکلا نہیں' کا فقرہ اہل حق کے فقدان کی غمازی کررہا ہے:

شاخ شجر سے پتے گرے جب بھی ٹوٹ کے
روئی تمام خلقِ خدا پھوٹ پھوٹ کے

اس شعر میں شہریار نے 'شاخ شجر' کو استعاراتی سطح پر برتا ہے 'شجر' اور 'شاخ شجر' کا استعمال مختلف معانی ومفاہیم کی ترجمانی کیلئے بیشتر جدید شاعروں نے کیا ہے۔ خصوصاً عرفان صدیقی، افتخار عارف اور باقی کے یہاں اس کا زیادہ استعمال ہوا ہے۔ عرفان صدیقی کا مشہور شعر ہے:

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر
یہ کیا پرند ہے شاخِ شجر پہ وارا ہوا

شہریار نے 'شاخِ شجر' کو ایک نئے سیاق وسباق میں پیش کیا ہے اس شعر میں 'شاخِ شجر' امام حسینؑ ہیں اور 'شجر' رسول خداؐ ہیں اور 'پتے' امام حسین کے اعوان وانصار ہیں 'خلق' سے مراد کوفہ وشام کی خلقت ہے اب مطلب یہ ہوا کہ جب امام حسینؑ کے اصحاب ان سے جدا ہورہے تھے تو تمام

خلقِ خدا مفارقت کے اس دل خراش منظر کو دیکھ کر گریہ کناں تھی، ہر چند کہ جیش حریفاں پر طمع دنیا غالب تھی مگر وہ بھی عالم تنہائی میں امام حسین کی مظلومیت پر پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا اس شعر میں ایک مفہوم یہ بھی پنہاں ہے کہ جب انسان حرص و ہوس میں مبتلا ہوجاتا ہے تو اس کی نگاہوں پر پردے پڑجاتے ہیں اور وہ حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے:

قطرۂ اشک سے آنکھوں کا بھرم باقی ہے
چھین لے جائے نہ اس کو بھی ہوا دنیا کی

اس شعر کا پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ مظلوم کی آنکھوں کا بھرم اس کے آنسوؤں کے قطرے سے قائم ہے اس کے 'کاسۂ چشم' میں صرف اشکوں ہی کی دولت ہے اگر وہ بھی اس کے پاس نہ رہے تو وہ تہی چشم ہوجائے گا اس لئے وہ اُس کے تحفظ کی ہرامکانی کوشش کررہا ہے کیونکہ اسے خدشہ ہے کہ کہیں اہل تخریب اُس کی اِس دولت کو بھی اُس سے چھین نہ لیں۔ اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حسین ابن علی کی شہادت کے بعد ان کے فرزند علی ابن الحسین جنہیں زین العابدین بھی کہاجاتا ہے شہادت حسین کے بعد ۳۵ برس تک واقعۂ کربلا کو یاد کرکے اشک افشانی کرتے رہے شہادت حسین کے ایک عرصہ بعد جب یزید بن معاویہ نے انہیں قید سے رہا کیا تو حکومت کی طرف سے ان کی تقریر پر پابندی عائد کردی گئی۔ ایسی صورت میں علی ابن الحسینؑ کی سب سے بڑی طاقت اور دولت ان کے آنسوؤں ہی تھے وہ نماز کے بعد دعائیں پڑھتے اور گریہ وزاری کرتے نیز اسی گریہ وزاری کے دوران دعاؤں کے ذریعے اپنے چاہنے والوں تک اپنا پیغام پہنچاتے۔ وہ دعائیں آج بھی ''صحیفۂ کاملہ'' کی صورت میں ساری دنیا کے انسانوں کیلئے مشعل راہ ہیں۔ اس مفہوم کو افتخار عارف نے اپنے ایک شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

طوالت کے خوف سے ہم مزید اشعار کی شرح وتعبیر سے گریز کرتے ہوئے اس سلسلہ کا آخری شعر پیش کررہے ہیں:

اہل وفا کو شوقِ شہادت ہے آج بھی
لیکن کسی کے ہاتھ میں خنجر نظر تو آئے

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اہل وفا (حق پرستوں) کو شوق شہادت آج بھی ہے لیکن باطل قوتوں کے ہاتھ میں خنجر (آلۂ ظلم) نہیں ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے تخریب کار ہمارے چہار جانب خنجر بکف موجود ہیں مجھے اس شعر کو پڑھتے وقت انیس اشفاق کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو باعتبار مفہوم شہریار کے شعر کے علی الرغم ہے:

جب بھی گھر سے نکلوں سب کے ہاتھ میں خنجر دیکھوں
کب تک اپنی آنکھوں سے میں لہو کا منظر دیکھوں

شہر یار کے شعر کا جو مفہوم ہے وہ یہ ہے کہ اہل وفا (حق پرستوں) کو ہر عہد میں شوقِ شہادت رہا ہے مگر اس کوفۂ نفاق میں اہل وفا ہیں کہاں؟ اور اگر ہیں بھی تو شہادت حسینؑ نے ظالموں کے حوصلوں کو اتنا پست کر دیا ہے کہ اب حق پرستوں پر خنجر چلانے کی ان میں ہمت نہیں ہے جس کی وجہ سے جذبۂ شہادت رکھنے والے اہل وفا تو ہیں مگر ان پر خنجر چلانے والے نہیں ہیں اور اگر اہل باطل خنجر بدست نظر آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان اہل حق موجود نہیں ہیں۔ اس شعر میں یہ مفہوم بھی پوشیدہ ہے کہ ظلم کی بالادستی ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی اس طرح بظاہر اس سادہ مفہوم کے حامل شعر میں کئی طرح کے مفاہیم موجود ہیں۔

شہر یار کے محولہ اشعار کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے واقعۂ کربلا اور اس کے تعلیقات کو ہمارے عہد کے مسائل کی ترجمانی کیلئے مؤثر ذریعہ اظہار کے طور پر استعمال کیا ہے اور بقدر امکان اس کے معنوی امکانات کو روشن کیا ہے نیز انہوں نے واقعۂ کربلا کی کثیر الجہات وکثیر الابعاد علامتوں کو اپنی نظموں اور غزلوں میں ان کی معنوی قوت کے ساتھ بروئے کار لا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہیں نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

کتابیات:

۱۔ شہر یار: ساتواں در۔ شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۱۹۶۹
۲۔ شہر یار: ہجر کے موسم۔ ترقی اردو (ہند) دہلی۔ ۱۹۷۸
۳۔ شہر یار: خواب کا در بند ہے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۱۹۸۵